

”تیرے پاس کاغذ ہے؟“  
”نہیں۔ کمپ سے نباؤں گا۔“

”کتنی پیسا ہے؟“  
”نہیں۔“

کشیری کاٹک رفع ہونے کی بجائے ہڑھا جاتا تھا۔

”تو ہے کون؟ ہمہ ہے تیرا مل نام کیا ہے؟“

اسد گھبرا گیا۔ ”میں بے دخل ہوں؛ وہ بولا،“ نام کے کیا ہتا ہے۔ میرا نام ایرہے۔ میرے بھائی کا نام  
اسد ہے۔“

بے دخلوں کے پاس شناختی کاغذ، تو اپے تیرے پاس کاغذ ہے، نہ پیسا ہے، دکری چیز ہے۔ تو  
کیسا بے دخل ہے؟

”میرے پاس کاغذ تھا۔ گم ہو گیا ہے۔ کمپ سے نیا نباؤں گا۔ اسی لیے جارہا ہوں۔“

”تُر زکہتا تھا۔ شستے داروں کو دیکھتے جاتا ہے؟“

”وہ کام بھی ہے۔“ اسد نے کہا۔

اس وقت تک کشیری کے ہیوی پھروں کے علاوہ دو چار اور ادھر ادھر کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب  
دہان کھڑے شے دالی نظرؤں سے اُسے گھوڑا ہے تھے۔ نیچے نیچے میں مکن ہے ہے کون ہے؟“ کے سوال انھوں رہے  
تھے۔ بے چاروں بے دخل ہے۔ ایک بڑھی خورت نے کہا۔ مگر اُس کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا، چیزے کہہ رہے  
ہوں، وہ تو ہے، مگر ہے کون؟ بے دخلوں سے ان لوگوں کی پوشیدہ نفرت کے آثار اب ظاہر ہونے لگے تھے۔  
”کہاں کا ہے؟“ ایک فوجران بولا، ”کوئی جائسوں تو نہیں۔“

فضا میں تشتہ دکانگ آچلا تھا۔ اسد خطرے کو جانپ کر مدد کھڑا ہوا۔ کچھ اور لوگ بھلی میں چلے آئے  
تھے۔ اسد نے محروس کیا کہ ایک لمحہ بھی اگر صایع ہوا تو بات ماتھے نہ کل جائے گی۔ ایک غلط قدم، اور یہ لوگ  
انھوں کی طرح اُس پر ڈٹ پڑیں گے۔ اُس نے لانٹھی اور گدر میں سنبھالی، اور مصنوعی غصے سے بولا؛ ”غیریجے دخل  
ہوں، خدا کا خوف کرو، مصیبت کا مارا ہوں، ایک گھٹری آدم کرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔“ اور جواب کا  
انتظار کیے بغیر تیز قدم سے چل بکلا۔ موڑ مرکر اُس نے دو ایک بار چیچے دیکھا تو اُس کو نسل جو گئی کہ کوئی  
اُس کا پیچا نہیں کر رہا۔ وہ چلتا گیا جثی کو گارڈ سے بکل کر جنگلوں میں پہنچ گیا۔ اُسے محروس ہو رہا تھا کہ اُس کا بادا

اُنہوں کی پیدا ہو کر چلا جا رہا ہے، جیسے کبھی کبھی خواب کی حالت میں وہ اپنے آپ کرنگے جن دوسرے کے پیچے دیکھا کتا تھا۔ اُس پر وہی سہم طاری تھا جو خواب میں اُس کے اوپر چھایا ہتا تھا۔ اُس کے سب اڑھنے پھونے اور پروے ایک ایک کر کے اتر گئے تھے۔ وہ جھلک کی چھوٹی سے چھوٹی اولاد پر چونک رہا تھا۔ بعد میں جب کبھی ان را قعدا کے اوپر دماغ دوڑانے کا موقع تھا۔ اُس نے یاد کیا کہ اُس کے فراری سفر میں شاید یہ وہ مقام تھا جہاں سے قسمت نے اُس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ کئی سال کے بعد ان پاؤں پر خود کرتے ہوئے ایک بار اُس نے سچا کہ قسمت ایک طرح کی ہمت ہوئی ہے۔ ہمت نوٹ جائے تو قسمت ساتھ پھوڑ جاتی ہے۔ اس جگہ پر پہنچ کر اُس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

ساتھ ساتھ اسے ان پاؤں کا برابر علم بھی تھا۔ اُس کا ہر دم چیتا جاتا دماغ سب چیزوں سے باخبر تھا۔ اُس کے اندر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی جگہ ابھی حادثی تھی۔ مگر اس باخبری نے اُس کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ دالا۔ اُس نے دوبارہ اپنا تاومِ تصرف راتجھے وقت کی ناشروع کر دیا تھا۔ دن کے وقت وہ آبادیوں کے قریب جانے سے ڈر نہ لگا۔ اُس پچھلے گاؤں میں اگر کوئی رپنا کوئی تھا، اُس نے سوچا، تو خبر کہیں کی کہیں پہنچ پہنچی ہو گی، آدم کا سارا وقت وہ اب کسی پہاڑ کی کھوہ میں یا جنگلوں میں بس رکتا۔ خدا کو وہ زیادہ تر درختوں سے اور کھیتوں میں کھڑی یا گردی پڑی فصلوں سے حائل کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھار وہ بھوک سے مجھر چکر کشام کے وقت کسی گاؤں کے باہر کسی کھلے دروازے پر چاکھڑا ہوتا اور اسے ایک وقت کی روٹی مل جاتی۔ مگر وہ دپانِ ٹھہر تا نہیں، کھانا کھاتے ہی رہا۔ سے چل بکھلتا۔ اب کبھی کبھی کمزوری کی لہریں اسے کمر کے پچھے حصے میں اور پنڈلیوں میں اترنی ہوئی معلوم ہوتیں۔ اُس کی ٹانگوں میں درد اٹھنے لگتا۔ چڑھائی کاراسٹہ ملے کرنے کے دوران اسے سانس پا بر کرنے کے لیے رکھنے کی غرورت محسوس ہوتی۔ اُس کی ایک چیلی نوٹ گئی تھی اور چلنے میں تکلیف دینے لگی تھی۔ اُس نے وہ چیلی آنار کر لائی کے ساتھ لشکار۔ اب اُس کے ایک پاؤں میں جو تما تھا اور دوسرا پاؤں نہ لگا تھا۔ پچھے دیر کے بعد اُس کا نیکا پاؤں قلعٹے لگا۔ اُس نے باہیں سے چیلی آنار کر دایں پاؤں میں ہپن لی۔ چیلی گر دوسرے پاؤں کی تھی مگر چلا جا سکتا تھا۔ تاہم تھوڑی ہی دیر میں اُس کا ہایاں پاؤں درد کرنے لگا۔ اُس نے دوسرے پاؤں سے چیلی آنار کر پھر اس پاؤں میں ہپن لی۔ اسی طرح وہ وقٹے وقٹے پر ایک چیلی کو دونوں پاؤں میں بدلتا ہوا چلتا گیا۔ اس سے صرف اتنا ہر سکا کہ وہ رات بھر چلپا رہا، مگر اب ایک کی بجائے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے دوسرا چیلی بھی آکھڑنے لگی۔ دن کے کسی وقت اُس نے دونوں ٹوٹی ہوئی چپلیاں ایک بھگر پر چھوڑ دیں۔ نگھنے پاؤں پھلنے سے اُس کے سفر کی رفتار کم پڑ گئی تھی۔ ایک اور مجھوڑی اس سے پیدا ہوئی کہ اب اُسے دیکھ جمال کر چلنا پڑتا تھا ماذھیر سے میں تیز پھر اور خاردار جا ریاں نظر نہ

اُن تھیں جو اس کے پاؤں کو کاٹ دیتی تھیں۔ چنانچہ اب وہ اپنا سفر پر پہنچنے پر شروع کرتا اور دہبہ تک چلتا رہتا، پھر سونھ فصلے پر چل پڑتا اور شام ہونے پر کسی جگہ جا رکتا۔ سفر چونکہ اب اجاتے کا پڑ رہا تھا، چنانچہ آبادیوں میں اُس کا پھر اکم سے کم ہوتا گیا۔ رات کو وہ کسی جگہ میں با چنان کے ساتھ لگ کر پڑ رہتا۔ جب سے اُس کا بے دخل کا روپ اُڑا تھا اُس کی نیند خواب ہو گئی تھی۔ اُپر سے سوتے جا گئے خواب اُسے سنگ کرنے لگے تھے۔ عجیب پرانے پرانی انجانی چیزوں کے اور جگہوں کے خواب مسئلہ آتے رہتے۔ سارا دن اُسے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے پھلی رات کے خواب یاد آتے رہتے تھے۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک لمبی بھی ایسی نیند نہیں سوپا جب اُس نے خواب مل دیکھا ہو۔ جیسے جیسے اُس کے خواب بڑھتے جا رہے تھے، ویسے ویسے اُس کا جاتا ہوا ذہن یا سین اور گشید کے شیر کے اوپر نکیہ کہا جا رہا تھا، جیسے کہ یہ دھوڑیں کریں ایسے اوزار ہوں جن سے اُس کے اندر کی ادھری ہمل جگہیں ساتھ رفہوتی چل جاتی تھیں۔ وہ جس چیز کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوتا یہ دستقل شکلیں اُس کے ذہن کے یہی منظر میں مٹڈلاتی پھتریں۔ اُس انکھی صورت حال میں، جس سے اُس کا سابقہ تھا، کم از کم یہ دشکلیں اُس کے ہاتھ میں ایسی آئی تھیں جو ایک سُتفل راستے کی تبدیر تھیں۔ ان سے اسد کو ایک سمت کا اشارہ ملتا، آرام حاصل ہوتا۔ آرام کی ضرورت اب اُسے بھوک سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ درد اُس کے پاؤں کی پڑیوں میں بیٹھ گیا تھا۔ ایڑیوں کے کنے سے پھٹ کئے تھے اور ہمیں خار پڑنے ہو کر اندر ہی اندر گوشت کی تہوں میں چل رہے تھے۔ وہ جہاں بھی رکتا گھنٹہ گھنٹہ بھر پاؤں کسی اور پئے پھر کے ساتھ آسان کی طرف اٹھاتے ہوا رہتا، تاکہ خون کا دباؤ ان پکم ہو۔ اس سے درد کو آرام ملتا اور آن کی سرجن میں کمی ہو جاتی۔ مگر جیسے ہی وہ چلنے کو ایک قدم رکھتا، ان کا سارا درد نوٹ آتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ سفری ادمی کے لیے شاید پاؤں کا ذخیرہ سب زخموں سے زیادہ سکھیت وہ ہوتا ہے۔

بکھتے ہیں کہ ہر بیماری کی کاث اُس کے اپنے اندر پہنچا ہوتی ہے۔ اس سے پیشتر کہ اسد کی تخلیق ناقابل برداشت ہو جاتی، در دخود بخود گھنٹے لگائیں اور ہوانے مل کر زخموں کے فنڈنگ کر دیے۔ اُس کے نکوں کی خلصت اور بے حس ہو گئی۔ وزن پُر نے پر پہنچی کے درد کی جلیں اٹھتی تھی وہ رُک گئی اور گوشت کے اندر زخموں کے چھوٹے بڑے گروں میں لذیذ سے درد کی حد بندی ہو گئی۔ اُس کا درداب اُس کا وجہ اٹھانے لگا تھا۔ اسی بھڑے چھوٹ کے اس کے اندر یک نیا جوش اور عزم پیدا ہوا۔ اب چاند اپنے خود رج پر تھا۔ چنانچہ وہ دن یا رات کے بھی وقت کو بھی اٹھ کر حسرتگرد جا رہی۔ رہ سکتا تھا ایک مقام سے رٹک کر دیکھو گلا اُس نے اندازو کیا کہ اب وہ سرحد سے ایک آدم روز کی دفعہ ہی پہنچ گا۔ اُس نے نئی روز سے پہلے بھر کر کھلیا تھا، مگر منزل خفریہ پر دیکھو اُس کے بدن میں نئی قوت پیدا ہوئی۔

سرحد کا علاقہ خطرناک تھا۔ حاجی طور پر شرک سے دُور از دُور رہ کر اُسے سرحد پار کرنی تھی۔ اُس نے اپنائی خود اسے تبدیل کر لیا۔ یہ ایک ایسا زاویہ تھا جو اسد کے اندازے کے مطابق اُسے ایک دو روز میں بالآخر شرک سے دو رے جائے گا۔ تاہم یہ ایک فاش غلطی تھی۔ وہ راستے سے بھٹک گیا۔

دو روز سے وہ اپنے نازدہ عزم کے ساتھ ایک سمت میں بُرھتا جاتا تھا کہ آہستہ آہستہ اُس کی حسن نے اُسے خبردار کرنا شروع کیا۔ جنگل میں سفر کرنے کرنے اُس کی حسن اتنی تیز ہو چکی تھی کہ اب وہ اپنے اندازے کی نسبت حسن پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ اُس کا اندازہ کئی بار غلط ہو چکا تھا، مگر اُس کی حسن سچی رہی تھی۔ وہ کوئی گیارہ رات کی مسافت پر تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک قطعی عیز آبادہ پھر میں پہاڑیوں کا ذخیرہ ہونے والا سلسلہ تھا۔ یوں دکھانی دیتا تھا کہ وہ ایک ہمینے تک بھی چلتا گی تو آبادی تک دہنچ سکے گا۔ اُسے یاد آیا کہ تقریباً دو گھنٹے سے اُس نے کوئی درخت بھی نہ دیکھا تھا۔ کسی مقام پر۔ اُس نے خیال کی، درست پتلے ہونے شروع ہو گئے ہوں گے۔ پھر دیکھے جالے بغیر، یہ پھر ملا علاقہ شروع ہو گیا اور جنگل ختم ہو گئے۔ مجھے یہ سب پچھلے نظر کیوں نہیں آیا؟ ہمیری پتھروں کو کیا ہو گیا ہے؟ اس نے دُور دُور تک نظر دوڑائی، آسمان کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف چاند کی روشنی میں جہاں تک نظر جاتی تھی پتھروں کی سیاہ اور سفید چیزوں کی خیجے تھے اور وہ ایکلا ذمی روح اُن کے درمیان گشیدہ کھڑا تھا۔ وہ کھڑا کھڑا رنگ نے لگا۔ سمت کا اندازہ کھو گیا تھا۔ اُس نے اتحاد بڑھا کر ایک پتھر کا سہارا لیا اور زمین پر پہنچ گیا۔ اُس کے پیٹ میں بھوک کی ایک تیز بہرا نہیں۔ اُس نے سرچھے بغیر گھٹھڑی میں اتحاد ادا کر چند پتے نکالے اور انہیں منہ میں بھر دیا۔ پتے نیم خشک ہو چکے تھے، مگر اُن کا مذاقہ اُبادہ تھا۔ اُن میں ملک لکھائی اور ملکی ہمیتی تھی۔ اس شخص کی ذاتے لئے اُس کے منہ میں اپننا ہوا لعاب پیدا کیا جس سے اس کا حلق تر ہو گیا۔ اُن کو آہستہ آہستہ چاکر لگھتے ہوئے اُس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ دہشت کا لمحہ گزگز گیا تھا کچھ دیر کے بعد اُس نے سییدھی طرح سوچا شروع کیا۔ اُس نے فیض کیا کہ بجلے اور اڑاکر کے اندازے لگانے کے لئے سب سے پہلے پچھلے پاؤں درختوں تک پہنچا چاہیے تاکہ کچھ خداک کا آسرا ہو۔ پہاں تو ایک دانہ منہ میں ڈالنے کو مستیا ب نہ ہو گا، اور پانی کا تو پہاں پہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُس نے جیلانی سے اپنے ارد گرد دیکھا اور آٹھ کر اُنہے پاؤں چل پڑا۔ پہلی سربراہ پہاڑی تک پہنچتے پہنچتے تھے میں گھٹٹے کے قریب گئے۔ بُرھی تھی۔ اس نے درختوں کے پتے اور چند خود رُدھجاؤں کے پھل، جو اُس کے علم میں تھے، کھا کر پیٹ پھرا۔ پانی کی تلاش میں وہ دوپہر تک چلتا رہا۔ آخر اسے دُور سے ایک سیاہ خود دی کبیر پہاڑی میں کھینچی ہوئی نظر آئی۔ یہ پانی کی نشانی تھی۔

وہاں پر پہنچ کر وہ قطرہ قطرہ گرتے ہوئے پانی کے بیچے منہ رکھ کر دیر تک پیتا رہا۔ پھر وہ سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ پہلے اس نے خیال کیا کہ وہ آئئے پاؤں چلتا جائے اور واپس اس مقام تک پہنچے جہاں سے اُسے آفری بارہٹک نظر آئی تھی۔ مگر یہ درد کا معاملہ تھا۔ پھر یہ بات بھی کیا نہیں تھی کہ وہ اس مقام تک پہنچتا ہے یا کہیں اور بکل جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ یہ سفر کو صایع کرنے والی بات ہے۔ اس کی بجائے اُسے کم و بیش اُسی سمت میں آگے بڑھنا چاہیے جس سمت میں وہ جا رہا تھا، صرف آنی اختیاط رہے کہ اب وہ جھگل کے ساتھ ساتھ چلے اور اس بے آب و گیاہ خلے میں زخمکنے پائے جہاں پہلے جا تکلا تھا۔ وہ اٹھ کر چل پڑا۔ اُوچی رات کے وقت وہ تھک کر ایک جگہ پر سو گیا۔ جب وہ جاگا تو پوچھنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ آبادی کا ورد در تک نام دشمن نہ تھا۔ اس نے گھر میں سے مٹھی بھرتے تکال کر مزدہ میں ڈالے اور انہیں چلانے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ جھگل کی جھاڑیوں کی نیت یہ ہے کہیں زیادہ قوت بخش تھے۔ یہ پتے سانس کو خیک کرتے تھے یا نہیں، مگر بدن میں گرمی ضرر پیدا کرتے تھے۔ اس نے تین چار سوچی بھرتے کھلنے۔ ہر سوچی کے بعد وہ گھر می کو ٹول کر دیکھ لیتا جو تیزی سے گھٹتی جا رہی تھی، مگر مزید ایک سوچی بھرنے سے باز نہ رہتا۔ جب وہ آخر تراپٹے اپ کر پہلے سے کہیں زیادہ زمانہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کی بھجوک اور پیاس بڑھی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ ان کی خاصیت ابھی ہے، اس نے سوچا مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ انہیں غلط مقصود کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ انہیں کم سے کم استعمال کرے گا اور کسی صورت بھی ایک وقت میں چند پتوں سے زیادہ نہیں کھائے گا۔ مگر اس وقت تک وہ گھر می جو پہلے ہی کا غذہ کی سی بلکی تھی، اور اب اپنی نمی صایع کرنے کے باعث اور بھی محضر ہو گئی تھی، تقریباً ادھی خالی ہو چکی تھی۔ اس نے اس پوٹلی کو کھول کر دوبارہ اس کی گانڈھ لگانی تاکہ لاٹھی کے سر سے پر کسی رہے۔ اس نے دوسرے تک سفر جاری رکھا اور اس دران تین چار پتے تکال رکھا ہے، ان پتوں کے تسلیم بخشش اثرات کے علاوہ ان کا ذائقہ اس کے منہ کو لگ گیا تھا۔ ان کے بعد کھٹے اور بلکے بلکے تمعج ذائقے کی لذت گو ایسی نہ تھی کہ ایک دم مزادی تھی، مگر انہوں نے اندر منہ کو لگ جانے والی تھی۔ بھجوک اور پیاس کی تسلیم کے لیے یہ بڑی اکسیر تھی، چنانچہ کسی دوسرے جھاڑ جھنکار کو پہنچنے پر اس کا دل نہ چاہتا۔ جب اسے حکس ہوا کہ پتے تیزی سے کم ہو رہے ہیں تو اس نے دوسرے تک انہیں مزدہ میں رکھا شروع کر دیا، تاکہ دیر تک پہنچتے ہیں۔ مگر رزوہ محض انہیں چڑھنے پر آگیا۔ وہ ایک ایک پتے کو مزدہ میں دالا اور اسے تالہ اور زبان میں دا بکھر چھوئے۔ وہ زبان بھی ملا نے سے گریز کرنا تاکہ پتے کو زیادہ گزندہ پہنچے، حتیٰ کہ کوئی آڈھ گھنٹے کے بعد پتا دیں پڑا۔ پڑا گھنٹہ کر ایک جھلکی کی شکل اختیار کر لیتا اور تماز سے چکپ جاتا۔ اس وقت تک اس کا تمام تر ذائقہ اس میں سے خارج ہو چکا ہوتا، چنانچہ وہ زبان اس پر سے ہٹا کر جلدی سے اُسے نگل لیتا۔ پھر دوسرا پتا منہ میں دال کر زبان اس کے

اپر و بادیتا بای طرح خوشی اور ستم، سو دن زیاب کے ملے جلے جیبات کے ساتھ، ان پریں سے خراک حاصل کرنا ہرا دہ چلتا رہا، اور کوئی ڈریڈن میں اس نے کافی فاصلہ لے کر لیا۔ اب اس علاقوں کی صورت کچھ بخوبی آرہی تھی۔ جنگلوں کی شادابی بڑھنی تھی، اور اسد کے تجربے نے اسے بتایا کہ جلد ہی اس کا راستہ کسی دادی میں بخوبی دالا ہے۔ افرانگ کے روز رات کے وقت وہ ڈھنے پڑا۔

غابرہ کے پریں کا اثر جھوٹا اور وقتی تھا۔ پتھے کتنا، ہی باہری اشیوں نہ سکھتے ہوں اُغرتپتھے ہی، ہو کے ہیں، خراک نہیں ہوتے۔ عارضی طور پر ان پریں نے اس کے بدن میں ایک طرح کی قوت پیدا کی تھی جس کے ذریب میں اس کر دہ چلتا گیا اور اس طرح اپنی رہی ہی طاقت بھی صرف کر پیٹھا۔ چنانچہ کوئی تیس گھنٹے کے مسئلے بے خراک سفر کے بعد اس کی انسڑیوں کے عوق سوکھ گئے اور اس کی ماٹھیں اس کے بوجھ کے نیچے ہجنول گئیں۔ وہ تینوں اگر کروپا۔ اس نے دو ایک بار اٹھنے کی کوشش کی، پھر گئیںی لپیٹ کر ڈھوان زمین پر نیم دراز ہو گیا۔ کھراہٹ کے عالم میں اس نے مٹھی بھر بھر کر پتھے مٹھے میں ڈالنے شروع کر دیے۔ اس تارہ خادثے نے بُونی پھاکر لے جانے کی سکیم کو تباہ کر دیا تھا، مگر کافی تعداد میں پتھے چاکر بخوبی سے اس کے بدن میں کچھ کچھ گرمی پیدا ہونے لگی۔ دھرپ بھی نکل آئی تھی۔ سوونج کی جدت سے کچھ دیر میں اس کا رزہ اڑ گیا اور وہ جلد ہی خندوگی کی حالت میں پہنچ گیا۔ نیم خواب کی حالت میں وہ گدڑی میں سر چھاپئے، پہلو کے بل سکن کر ایک پھر تک پڑا۔ کئی سرتے چل گئے ہرنے خواب اس کی اسکھوں سے گز رے۔ ان خوابوں کی شکل بھی نئی تھی۔ ان میں جنگلی جانوروں کی بھرا رکھتی بھیجیت عزیب شکلوں کے درمیانے مختلف چانوں اور دختوں کے عقب سے بخل مخل کر اسے ڈرا دھکار ہے تھے۔ ان میں سے کئی انسانوں کی آواز میں باقیں کہتے تھے اور بعض کے چہرے بھیجیت الحلقہ تھے۔ وہ بار بار خواب میں چونک اٹھتا۔ بیچ بیچ میں وہ جاگ کر آنکھیں کھولتا تو ایک لمبے میں منظر صاف ہو جاتا اور اس کے ذہن کے پردے پر وہی دوستقل صورتیں، مشعلوں کی مانند گڑھی ہوئی، نظر ایس جس سے سب بلا میں غایب ہو جاتیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پھر آزاد روہی سے اس کے اندر اور باہر جا رہی دسارتی ہو گیا ہے جس پر سے اس کا اختیار اٹھا چاہا رہا ہے۔ اس کا جو چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی گڑھی کے گرم گھروندے میں اسی طرح پڑا رہے اور کبھی دہان سے نہ پڑے جسی کہ وقت کا یہ شکر تھم جائے۔ اس کے جسم کو آرام مل رہا تھا۔ اسی حالت میں لیٹھے ہوئے ہنسنے خیال ہوا کہ ایک ماڑس آواز اس کے کان میں پڑ چکھے۔ یہ میرحسن کی آواز تھی۔ پہلے اس نے سرچاکہ نہ حسب مہول کرنی خواب دیکھ رہا ہے۔ پھر اہستہ آہستہ وہ خواب کی کیفیت سے بخل آیا۔ اس نے حیرت نہ دہ ہر کر دیکھا کرو خود، مٹھے گڑھی سے نکالے، آنکھیں کھولے بیٹھا ہے اور میرحسن اس کے سامنے سکھڑا اس سے خاطلب ہو رہا ہے۔

”بہاں کیا کر رہے ہو؟“ میرحسن اُس سے پوچھ دیا تھا۔ اُس کا بھروسہ مگر نہ ہوتا تھا۔

”پکھ نہیں۔“ اسد نے جواب دیا۔

میرحسن کے چڑاہ دو اور کثیری تھے جو ذرا دُور ایک درخت کے ساتھ بیٹھے روٹی کھا رہے تھے۔ میرحسن کو اپنے سامنے پا کر اسد کے دل میں خوشی کے نیز متوافق خوبیات اٹھتے تھے، جیسے اُس کو کافی انعام اسہار اہل گیا ہو۔ میرحسن نے چند لمحے تک گھری نظر دن سے اُسے دیکھنے کے بعد بجک کر گدڑی کا پلو اٹھایا اور اسد کے جسم پر ایک نظر والی۔

”تمہارے پاؤں ناکارہ ہو گئے ہیں۔“ وہ تشویش سے سر ملا کر بولا۔

اسد نے گدڑی اُس کے ہاتھ سے کھینچ کر اپنے گرد پیٹ لی۔ ”پہلے بہت خراب ہو گئے تھے؛ اُس نے کہا،“ اب بھیک ہیں؟“

”اس دھوکے میں زماں۔“ میرحسن بولا، ”پیر کا رخم برا ہوتا ہے۔ اندر ہی انہوں نے جاناتے ہے؛ اُس نے لامبی کے سرے پر بندھی ہوئی پوٹل کو سُرل کر دیکھا۔“ تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟“

اسد نے نقی میں سر ملا دیا۔

”کب سے بھوکے ہو؟“

”میں چار دن سے۔“

میرحسن نے اپنی جیب سے ایک پوٹل نکال کر کھوئی۔ اُس میں چار موٹی موٹی روپیائیں بندھی تھیں۔ اُس نے وہ روپیائیں نکال کر اسد کے ہاتھ میں تھما دیں۔

”یہ تو وہ بولا،“ اُس دھیری کے پیچے گاؤں ہے۔ اُدھر تمہیں کچھ نکھل جائے گا۔ کوئی پیسا ہے بڑے؟“ اس نے روٹی توڑ کر منہ میں بھر لی تھی اور نقی میں سر ملا دیا۔ میرحسن نے جیب سے ایک ایک روپے کے میں چار لوٹ اور کچھ سکتے نکال کر اسہ کو دیے۔ ”جزیخ گئے اُدھر جا کر بھینک دینا۔“ میرحسن نے کہا۔ اسد نے لفڑ اور سکتے کر جیب میں ڈال لیے۔ روٹی چانے سے اُس کے جبڑوں میں دد شروع ہو گئی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ اُس کا خشک حلق نکلا جسے نزہور رہا تھا اور اُس کی نوجوان رگوں میں خون کی جدت آنے لگی تھی۔ میرحسن اُس کے پاس زین پر بیٹھ گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اسد نے لُقر مکمل کر لپوچا۔

”اُدھر سے آ رہا ہوں۔“

”اس راستے سے ہے“

”میرا بھی کستہ ہے ہے“

”کب گئے تھے؟“

”پسون“

”گشاد گئے تھے ہے“

میرسن نے نقی میں سر طلبایا، ”وقت نہیں تھا۔“

”ذوق قار سے ملاقات ہوئی؟“

خدا نہیں۔ میرسن نے دوبارہ سر ٹالا کر کہا، ”مگر سب تمہارے انتظار میں ہیں۔“ اسد کو علم ہو گیا کہ میرسن سب حالات نے باخبر ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہی فڑ توڑ کر کھانا سا۔ ”بارڈ کو دھر جے ہے؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا۔ ”وہ سرخ ڈھیری باڈر ہے۔“ میرسن نے ماتھی میں کچھی ہولی بیل سی شدغ کی چھٹی اٹھا کر چوچتی پہاڑی کی جانب اشارہ کیا۔ ”ادھر کوئی خطرہ نہیں۔ اچھا کیا ادھر آگئے۔“ انھیں بند کر کے بھی جاؤ تو بیل جاؤ گے ہیں کوس پر سڑک مل جائے گی۔ سیدھے ماتھ پر ہو جانا۔ گشہ — — ” وہ بازوں بیاسیکے چھٹی کرنصف دائرے ہیں دور تک گھماتا گیا، ”وہاں پر ہے۔“ اس نے جنوب مغرب میں افغان پر چھٹی کو ظہرا کر کہا، ”تین دن کا سفر ہے۔“ تمہاری حالت اچھی نہیں، چار پانچ دن لگ جائیں گے۔ سڑک پر کوئی سواری مل گئی تو ایک ہی دن میں چلے جاؤ گے۔ مگر اچھا ہے سواری سے دور ہی رہو۔“

”بکبوں ہے؟“

میرسن جواب دینے کی بجائے گھری نظرؤں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسد نے پھر عین فڑ توڑ کر کھانی شروع کر دی۔ میرسن کا چہرہ، اس کا جسم، اس کی شکل وہی تھی، تیز ارناز ک، مگر اس کا انداز پختہ ہرگز کا تھا، اس کی انکھوں میں رُکپن کی جھجک نہ ہی تھی، اس کے لیے میں مہلک تجربے کی جملک تھی، جیسے اس نے اور میوں کو مرنے ہوئے دیکھا ہے، اور دنیا اس کے آگے کھل بھی گئی ہے اور بند بھی ہو گئی ہے۔

”تم بہنے بغیر کیوں بھاگ آئے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا کام ختم ہو گیا تھا۔“ اسد نے جواب دیا۔

”بنا کر آتے تو کیا حرج تھا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔“

اسد نے روئی کا آخری نواہ منہ میں ڈالا اور دوسری روئی کو تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ میرسن کی انھیں

مسلسل اسد کے چہرے پر گلی تھیں، جیسے وہ پکھ سوچ رہا ہو۔ پھر وہ تائیت سے سر بلکہ کر بولا، ”تم بھی کب مصیبت میں پھنس گئے ہو۔“ اور حکلہ نامہ اُدھر ہوا۔ وہ اُنھے کھڑا ہوا۔ اب یہاں سے آئیجاو۔ یہ جگہ ایسی علیبِ آباد نہیں جیسی نظر آتی ہے۔ آج رات کو نسل جانا۔“ وہ چل پڑا۔

خوری دُور جا کر میر حسن نے اچانک مرکر اسد کی طرف دیکھا، دیکھو بھال کر جانا۔“ وہ فکر سے بولا۔

اسد نے میر حسن کو ان دو امیروں کے درمیان متوالن چال سے دُور جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اعتماد سے چل رہا تھا۔ اسد کو وہ میر حسن یاد آیا جو بھی چند ماہ پہلے ایک نو عمر دیہاتی رُک کے کی صورت مطلب کے صحن میں بیٹھا اپنی پھکتی ہوئی ہمکھوں سے اُس کی طرف ایسے دیکھا کہتا تھا جیسے اُس کی پستش کر رہا ہو۔ ان چند ہمیزوں میں کیدے سے کیا ہرگیا تھا۔ اسد کے دل پر اچانک یہ گہرے افسوس کا سایہ آت آیا، جیسے پہلی بار اُس پر اپنی اصل حیثیت کا انکشاف ہوا ہو۔ وہ ایک جانب سے دوسری جانب کو جارا تھا، مگر یوں جیسے باہر کر چلا جارہا ہو۔ یہی کسی ایک طرف سے بھی والبت نہیں ہوں، اُس نے سوچا۔ یہ کیسا کھنڈن کام ہے۔

اُسی رات کو اُس نے سرحد پار کی۔ مرکر نظر آئے پر وہ دہنے والی تھک کر مرگ کیا اور فاصلہ رکھ کر مرکر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کھانا حامل کرنے کی وقت اب پڑی حد تک ختم ہو گئی تھی، مگر اُس کے پیوں پھر اسے تکلیف دینے لگے تھے۔ ان میں سوچن پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کے پڑے پھٹ پکے تھے اور سر کے بال گندگی کے باعث چپک کر لئوں کی صورت میں لٹک رہے تھے تاہم منزل مقصود کی جگہ نے اُس کی کھوفی ہوئی طاقت گریا واپس رہا وہی تھی۔ وہ اپنی وحشتی، جس کے سر سے پہ نہ ہوئی پوٹلی کا جنم اب مٹھی برا برہ گیا تھا، کندھے پر رکے، گھٹدی سنبھالے، پچھا بچا ہوا اپنی منزل کی جانب بڑھتا رہا۔ جگہ جگہ پردہ اپنے پیروں کو آرام دینے کی غرض سے بیٹھ جانا، پھر انہوں کی چلنے لگا۔ غریبیکار اسی طرح، انتہائی انفلات کی حالت میں سفر کرتا ہوا وہ اپنے فرار کے ایمسیوں دن گشید پہنچا۔

(۱۲)

”اُس وقت بھی،“ اسد نے یاسیمن سے کہا، ”جب یہرے دل میں اندر چرا ہو چکا تھا، تمہاری شکل سے مجھے سہارا دیا۔“

یاسیمن فرش پر بیٹھی تھی۔ ”کب؟“ وہ بدل۔

”جب ایک ایک کر کے ساری آپدیں میر ساتھ چھوڑ گئیں۔“ کری پہ بیٹھے بیٹھے اسد نے دیکھ لیجے میں بات کی، ”جب میں ادھر سے اوھر آگیا اور مسلم چوا کر کوئی فرق نہیں پڑا، میں باہر کا باہر رہ گیا ہوں۔“ اُس نے گرم پانی کی چپھی میں رکھتے ہوئے اپنے پاؤں کو اور ان کے ساتھ یاسیمن کے اوہ ڈوبے سفید اغصون کو دیکھا۔ ”اُس وقت یہرے دل میں اندر چرا ہو گیا۔“

یاسیمن نظر باندھے اُس سے دیکھ جا رہی تھی، جیسے اُنکی کو صرف دیکھنے سے مغلب ہو۔

”اُس وقت ایک تمہاری شکل تھی جس نے میری جان کو ہمارا دیے رکھا۔“ اسد نے کہا۔

”تمہیں یہری شکل یاد تھی ہے۔“

”ہاں“

”مجھے تو تمہاری شکل یاد ہی نہیں آتی“

”تمہاری یاد و اشت خراب ہے؟“ دو ہنسا، ”یا تم بے دفا ہو؟“

”نہیں، اسدی بیوی پرچ ہے؟“ دو بڑی، ”تم جیسے ہی لظفوں سے او جمل ہوتے ہو، میں لا کھ کر شش کر دیں گے تمہاری شکل یاد نہیں آتی۔ یہ کیا بات ہے؟“

”میرے اور تمہارے اندر بھی ایک فرق ہے؟“

”کیا فرق ہے؟“

”تم مجھے اپنے سامنے رکھنا چاہتی ہو۔ میں جہاں چاؤں تم میرے ساتھ رہتی ہو۔“

”پھر کس کی بات پتھی ہے؟“ یاسین نے پھر کی طرح سوال کیا۔

”دونوں کی؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں؟“

”ایک کی بات پتھی ہو گی، ایک کی جھوٹی۔“

”اوہ ہوں؟“ اسد نے سر ملا کر جواب دیا، ”دونوں کی پتھی ہے۔“

”کیسے؟“

”ہم دونیں، مگر ایک ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”پھر تمہیں کتنی فرق نہیں پڑتا،“ یاسین نے لوچا، ”چلے ہے میرے پاس رہو، چاہئے چلے جاؤ؟“ اسد کی دلیل اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی جہاں وہ یاسین کو جواب دینے سے قاصر تھا۔ مگر اپنے دل کے اندر اسے احسان تھا کہ ان کا ایک ہونا جادبے جا کا معاہد نہیں، ایک خیال کی بات ہے۔ یا صرف مل کی زدیں ہونے کا سوال ہے۔ اسد نے محسوس کیا کہ یہ احساس تو پیدا ہجھی نہ تھا، بلکہ ایسا تھا کہ جیسے تما دیر بوجا رہا ہو۔

یاسین کے گالوں پر آنسوؤں کے وجہے ابھی موجود تھے۔ اُس کا بھرا بھرا بدن زمین پر لیک ایسی چنان کی مانند تھا جو اپنے تیز اور نازک کونوں پر جنم کر کھڑی ہو مگر دیکھنے میں بے توازن معلوم ہوتی ہو۔ اُس کے سفید کر تئے کے اندر بدن کل سلوٹیں دبیز ہو چکی تھیں۔ اسد نے جھگ کر ہاتھ سے اُس کے پدن کو چھوڑا۔ یاسین

کے پھرے پر نگ گھرا ہو گیا۔

”تمہیں کب پس اچلا تھا ہے“ اسد نے پوچھا۔

”تمہارے جانے کے بیس دن کے بعد۔“

”تمہیں خوف نہیں آیا ہے“

”کس بات کا خوف ہے“

”اپنا“ اسد نے کہا، ”لوگوں کا۔“

”لوگوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے وہ بولی،“ مجھے صرف تمہارا خوف تھا۔“

”میرا خوف تھا ہے“

”ہاں۔“

”کس بات کا ہے“

یاسین دیڑک نظر پاندھے سوچتی رہی۔ ”میں نے شام کے اندر ہرے میں تمہیں دُور سے صرف چند لمحوں کے لیے دیکھا تھا۔“ وہ بولی، ”تم میری طرف پشت کیے کھڑے تھے۔ بس۔“ عرف بھی ایک رائق ہوا تھا۔“

اسد حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ یہ تو پہلے پہل کی بات ہے۔

”ہاں۔ مگر اُنہی سی بات ہوئی تھی۔ مجھے اعتبار نہیں آتا۔“ مجھے خوف رہتا ہے تم ادھر ہو جاؤ گے۔  
تمہاری شکل یاد نہیں آتی۔“

”تم تو ہیو قوت ہو۔“ اسد نے مجک کر اُس کے پیٹ پر آہستہ سے ہاتھ پھیلا کر رکھ دیا، ”تمہیں اس پر اعتبار ہے بھ۔“

یاسین نے اپنا ایک ہاتھ پانی سے نکالا اور اُسے اسد کے ہاتھ پر رکھ دیا، ”ہاں۔“ وہ بولی۔  
اسد نے مخصوص کیا کہ اس رات کے عرصے میں پہلی بار یاسین کے مدد سے یک یقین کی بات سکھل تھی پہلی  
کے وقت جب یاسین نے دروازہ کھول کر اُسے باز روئی میں تھام یا تھا، اُس تھکے اڑے ہوئے جسم کو کرسی پر جھکا  
کر اُس کے بال و حریقے تھے اور ان میں تیل دُال کر لگھی کی تھی، پھر گیلے تو یہ سے اُس کے پہن کوں مل کر صاف  
کیا تھا اور خشک ہونے پر جھیم کے کپڑوں کا سفید جوڑا پہنیا تھا، اُس کے بعد فرش پر بیٹھ کر، چلپھی کے اندر لکھ اور  
تیل ملے گرم پانی میں اُس کے پاروں ڈبو کر رہیں ہوئے ہوئے ملنے لگی تھی تو اس دو ران میں اُس نے رد تے اور بننے

ہر نے سینکڑوں باتیں کی تھیں، پچھلے اپنے آپ سے، پچھا اس کے ساتھ، پچھا بات چیت کے انداز میں، مگر تمام تربے خود بہادر کی حالت میں، جیسے ایک شورخ اور بہت خراب میں صرف رہتے ہیں۔ اسی بہادر کے پیچے اس نے لپٹے پیٹ کا ذکر بھی کیا تھا، مگر اس طرح کہ جیسے کہ اس کی حقیقت غیر معروف ہے، یا کہ اتنی ہی اہم ہو جئی وہ صرفی باقاعدے کی حقیقت۔ مگر اب، جب کہ اسد بھی کے دو پیالے پیٹے کے بعد اور یہم غزوہ کی کل حالت میں یا سین کی باتیں سننے کے بعد زید اسہر کراپنی کی بھافی بیان کرنے لگا تھا تو یہیں نے اس سوال پر اس طرح اس کیا تھا کہ جیسے اس کے دل میں صرف اس ایک بات کا اعتبار ہے، اور پچھلے بھی نہ ہے۔

”زمین کا سودا ہو گیا ہے۔“ پچھلے دیر کے بعد وہ بولی۔

”کس سے؟“

”ذارگل سے۔“ وہ بولی، ”قیمت پچھلے کم دے رہا ہے۔ مگر لقد دیشے کا وعدہ کر رہا ہے۔ مکان اور مطلب والی زمین کا بھی سودا ہو جائے تو فیصلہ ہو۔“

باتیں کرتے کرتے یا سین نے باخنوں سے ہوئے ہوئے رگڑ کر اس کے پیر صاف کر لیے تو گدے پانی کی ہلکی اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں اور موٹی ملکل کے ایک دو پٹے سے لمبی لمبی پیاس پیاس چھاڑ کر انہیں پیروں کے گرد لپٹنے لگی۔

”جلدی کی کیا ضرورت ہے؟“ اس نے کہا، ”یہاں ہی ہے تو مناسب قیمت نے ریچھو۔“

”اب نہیں بیاں رہنا نہیں چاہتی۔“ یا سین نے اٹھ کر اس کی کرسی کا رُخ موڑا اور اس کے پیر اٹھا کر آہستہ سے چار پائی پر رکھ دیے پھر وہ اس کے پاس چار پائی پہ بیٹھ گئی اور میوں کو دوبارہ کھول کر مٹیک سے باز منٹنے لگی۔ اس نے پڑھ اور سُن رکھا تھا کہ اولاد کی عبردل میں ایک عجیب سرمنتی کا خدیہ نہیں اکتی ہے۔ یا سین کو انہاں کے پیاس کھوتے اور باز منٹتے ہوئے دیکھ کر اس نے سوچا، وہ بات کیا غلط تھی ہے غلط نہیں تھی تو وہ جذبہ کہاں تھا ہے اپنے اندر گجد چکر پر اس نے جانکر جانکر کر دیکھا، جیسے کسی ناقص شہین کے اندر نظرِ وال رہا ہو، مگر دعیت کی سرخوشی کیلئے دکھائی نہ دی۔ اس دیسیع و غریض سرزین پر اب صرف ایک احکام چایا تھا۔ کہ بہت سی باتیں غلط نکل آئیں ہیں، بہت سی دل کی زوب سے باہر جائیں گے ہیں، اب وقت نہیں۔

”یہ شور کیسا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بیا اتر ہے۔ ہانچے کو جائے ہے ہیں۔“

”اچھا؟“

اسد نے اٹھنے کی کوشش کی تو یا سہیں نے اُس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ ”بیچھے رہو۔ پھر بچٹ جائیں گے۔ باہر تم نے دیکھا نہیں ہے۔“

”نہیں۔ یک طرف سے آوازیں آرہی تھیں، مگر کوئی دکھانی نہیں دیا۔“

”چار پانچ دن سے تیار ہی ہو رہی ہے۔ پشاور کی طرف سے یک شکاری آیا ہے۔ کہتے ہیں شیر کا پڑا شکاری ہے۔ جنگلات کے افسروں نے انظام کیا ہے۔“

”شاہ رَحْمَنِ بھی ساتھ ہے؟“

”اسد ہی، تم نے میری کوئی بات نہیں سنی۔ یا سہیں نے کہا، شاہ رَحْمَن کی تبدیلی ہو گئی ہے۔“  
”کب؟“

”ایک عہدینہ ہو گیا ہے۔ تمہیں اُتے ہوئے باہر کرنی نہیں ملا ہے۔“

”اوہر۔ دو تین آدمی گز سے تھے، مگر کسی نے پہچانا نہیں۔“

”کون تھے؟“

”پتا نہیں۔ اندھیرا تھا۔“

باہر اپنے آوازوں کا شور یوں سنائی دے رہا تھا جیسے جلوس آن کی دیوار کے پاس سے گورہ ہوا۔ اسد نے پہنچنے والے سہیں کے ہاتھوں سے چھپڑا نے اور انہیں زمین پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بوچھ پٹنے پر پیروں میں پھر لیکے مذہبیسا، گہرا سادہ دلٹھا جس کی تیز و حادہ عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔ یا سہیں چار پانچ بیجھی فکر منہ نظر میں سے اُسے مرش پر آہستہ آہستہ چل کر کھڑکی تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسد نے کھڑک کھولی تو آوازیں کرے ہیں آواخِل ہوئیں۔ آدمی جا چکے ہیں۔ شکاری اُن کے ساتھ ہے۔ یا سہیں بولی، باقی کے اب جا سہے ہیں۔ رات کو ہانک لگائیں گے۔ پہلے دو دن تک اُدھر بکرا باندھ کر گھات میں بیٹھے رہے ہیں، مگر مگچھ پھٹکا تک نہیں شکل کی

کا کہنا ہے چادر چالاک ہے، غسل سے قابو میں آئے گا۔ آج افسروں نے شکاری کو صرف ایک دن کی اور مہلت دی ہے۔“

”کیوں؟“

”افواہ ہے جنگ شروع ہونے والی ہے۔“  
آن کے ہاتھوں میں جیسا کی مشعلیں تھیں اور وہ ایک ایک کر کے نیچے کتی کو جانے والے رشتے پر اترتے جا رہے تھے۔ مشعلوں کی روشنی گاؤں کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ جب دو فانگلہ اڑاں میں عائب ہو گیا تو فضائیں ایک

روشن خبار ان کے سروں کے اوپر اور دوڑک چلتا رہا۔ اب ان کی آوازیں دُور سے آرہی تھیں۔ اسد کی مانگیں گپکپانے لگیں۔ اُس نے کہنیاں کھڑک میں رکھیں اور ان پر بدن کو سہار کر کھڑا ہو گیا۔ پاؤں پر پوچھ کم ہوا تو پیریں کو کچھ آرام آیا۔

”جگ شروع ہونے والی ہے ہے اُس نسبے خیال میں وہرا یا۔“

”ماں۔ افواہ ہے ایک دو دن میں شروع ہونے والی ہے۔ ہر وقت چہاز پھرتے رہتے ہیں تم نے بھی دیکھے ہوں گے۔“

”ماں۔“

”کل دو چہاز ہمارے گھر کے اوپر سے گزرے تھے۔ اتنے نیچے کہ آواز سے کان پھٹ گئے۔ سدا گاؤں نکل آیا تھا۔ فوج کی ہمکہ بندی ہر طرف ہو رہی ہے۔ مشکل سے سرکار نے ایک دن کی اور بہلت دی ہے۔ ہی لیے رات کو ہانکھوار ہے جس۔ اسد ہی، کھڑکی بند کر دو۔ سروہی لگ جائے گی۔“

دفعہ اس کو حساس ہوا کہ وہ آنکھیں کہیں کھو گئی ہیں۔ اُس نے انہیں میں دُور دوڑک نظر دوڑائی۔ جنگل خال تھا۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں پسخ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ شیشیوں کا عکس نہ دو دیکھیا۔ اُس کا دل خال پڑا تھا۔ وہ انگارہ سی جلتی نہیں ہوا ہو گئی تھیں۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس کے دل میں یہ خدا شہزادی سے تھا کہ ایک نہ ایک دن اُس کی نظر کی جائے گی۔ اُس بجا بیانی آنکھیں بند کر کے دیکھا۔ خیال کی توت سے اسے برآمد کرنے کی کوشش کی۔ آخر پلکیں گرد کر دیڑک سن کھڑا رہا۔ مگر وہ شیشہ اب غائب ہو چکی تھی، جیسے ہوا میں تحمل ہو گئی ہو، یا ایک حربت بھر کر کسی ٹھہر کر نکل گئی ہو۔ اس پر اُس کا یہاں رات تھا، جیسے ہر ایک کا کسی ذکری پر ایمان ہوتا ہے۔ اب وہ کے دھونڈے گا ہے کس شے پر اپنا قیدین رکھے گا ہے وہ ایک لہاچکر کاٹ کر گریا اُسی مقام پر آپنی پتا تھا جہاں گھر کے اندر ایک ایک کر کے کو اڑوں کے بند ہونے کی آوازیں آرہی تھیں، اور وہ پچھا اپنی دوچار چیزیں مجیکے میں فال کر باہر گئیں نکل آیا تھا اُس کی نظر بے اختیار اسماں کی طرف آئی۔ شروع تبرکی رات تھی اور عنکب ہوا اُس کے چہرے سے مگر اسی تھی۔ دُور نیچے اُس بُل کھاتے ہوئے پہاڑی رستے پر اب وہ جلتی ہوئی پھر پھر اُس کی نظر وہ سامنے آگئی تھی جہاں وہ مشعلیں اٹھائے جنگل کو جا رہے تھے۔ ”عزمی۔“ اُس نے زیر لب کہا، ”بُرول۔“

وہ کھڑکی بند کر کے نوٹ آیا۔ چار پائی پر بیٹھ کر اُس نے پوچھا، ”ذوالغفار کے آدمی کب آئے تھے ہے؟“

”پچھلی اتوار کو۔“ یا سین نے کہا، ”بعد میں بھی آئے ہیں، مگر باہر سے ہی پوچھ کر چلے جاتے رہے ہیں۔“

اسدی ہے؟“

”ہوں۔“

”تمہارے اور پرکرنی پا بندھی تو نہیں تھی ہے۔“

”اوہ نہیں۔“

”پھر وہ آدمی کیوں آئے تھے؟“

”خیر خبر پوچھنے آئے ہوں گے۔“ اسد نے تھکے ہونے ملے ہے میں جواب دیا، وہ تکے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”یاں ہے“ وہ بولا، ”تم تو کہتی تھیں تم اپنا گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتیں۔“

”یہ میں اس وقت سوچتی تھی جب تم میرے پاس تھے؟“ وہ بولی، ”جب تم چل گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے اور پرہیزی میری جان کا اختصار ہے اور کسی بات کی حقیقت نہیں۔ اسد ہے۔“

”یاں۔“

”تم کیا چلتے ہو۔ میں یہاں رہوں یا چلی جاؤں ہے؟“

”تم اپنی مرضی کی ملک ہو۔ میں تو چاہتا ہوں جہاں رہوں میرے ساتھ رہو۔“

”تم بھی تو کہتے تھے۔“ یہیں نے اپنا چہرہ پوچھا، ”کہ اپنے عمل سے ایک قدم اٹھانا چاہتے ہو۔ اب

مطمئن ہو گئے ہو ہے۔“

اسد پرستک اس کے چہرے پر نظر چلائے دیکھتا رہا، جیسے کسی بات کا خیال کر رہا ہو۔ میں اسے کیا بناؤں اس نے سوچا، کہ بے عمل سے ہم شکار بننے ہیں اور عمل سے قائل ہے۔

”یاں۔“ اس نے آہتہ سے کہا۔

یہیں اس کے یہنے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

جب دروازے پر دستک ہٹلی تو اسد اٹھا بیٹھا، جیسے وہ پہلے سے ان کا منتظر ہو۔ اس کے ہدن پر گو تھکن کے آثار تھے، مگر اس کے چہرے پر اٹھان تھا۔ اس نے پامنی کی جانب سے حکیم کا جتنا اٹھا کر پہنچنے کا لشکر کیا ہے، مگر پیروں میں بندھے ہوئے پیر چوتھوں میں داخل نہ ہو سکے۔ چند لیکنڈ کے بعد وہ اس کو شکش کو ترک کر کے اٹھا کر ہوا۔ ہدن کے پوچھ کر پاؤں پر استوار کرنے کے بعد اس نے اپنا بیاس دست کیا اور آہتہ سے فرش پر ایک قدم اٹھایا۔ اسد کا قدم لٹختے ہی یا سکیں، جو پاؤں کے پیسوں پر اپنا جسم سنبلائے گم نہم بینجھی تھی، لپک کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہے ہو ہے؟“

”ذوالفقار کے اُدمی آئے ہوں گے؟“ اسد نے الطیبان سے کہا۔

”نہیں کیسے پتا ہے؟“

”میرا خال ہے وہی ہوں گے، اس وقت اور کون ہو سکتا ہے؟“

”کیوں بھی کیوں نہیں ہو سکت ہے وہ بول،“ اس وقت کیا کرنے آئے ہیں؟“

”کوئی پیغم وغیرہ کے کر آئے ہوں گے؟“ اسد نے کہا، ”فکر کی کیا بات ہے؟“

”یہ جاتی ہوں“ یا سہیں اُس کے بازو پر ما تھر کھکھ کر بولی، ”تم نہ جاؤ۔“

”تم ان سے کیا کہو گی بھی ناکہ میں اندر بیٹھا ہوں۔“

”یہیں ان سے کہوں گی صبح کے وقت آئیں؟“

”کیا فائدہ ہے ایک بار توجہے ذوالفقار سے ملنا ہی ہے؟“ اسد صبر سے بولا۔

دستک دوبارہ ہوئی۔ رات کے شانے میں کھڑی کے دردائے پر دستک والا ہاتھ بھاری پتا ہوا  
شانی دیا۔ یا سہیں کے چہرے پر ہر اس بھیل گیا۔

”اسد،“ وہ بولی، ”میرا دل ڈر رہا ہے۔ مت جاؤ۔“

”بیوقوفی کی بتیں مت کرو۔“ اسد نے اُس کے کندھے پر ما تھر کھکھ کر تسلی دی، ”ڈنے کی کیا بات ہے۔“

ابھی ان سے بات کر کے آجائما ہوں؟“

جب اسد نے تاریک سجن میں قدم رکھا تو وہ بولی، ”جلدی آجائما، اسدی۔“

”ابھی آتا ہوں۔ تم یہیں بھجو رو۔“

مگر وہ اُس کے یہ پچھے چھپے دروازے تک چل آئی۔ ان سے کہنا ابھی تمہارے پر خراب ہیں۔“ وہ چھپی  
رہی، ”ایک دو دن کے بعد آؤ گے۔“

”لوں ہاں، ایک دو دن کے بعد۔“ اسد نے سنجیدگی سے سر بلایا۔

”ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”ہاں۔“

مگر وہ کندھی آمد نے لگا تو یا سہیں پھر اُس کے سامنے آگئی۔ ”محضی دیر اور دیکھ لو، اسدی۔ شاید چلے

جائیں۔“

”نہیں جائیں گے؟“ اسد آہستہ سے اُس کے کندھے پر ما تھر کھکھ کر بولا۔

"کیوں؟"

"اس طرح نہیں جائیں گے، وہ بولا،" ابھی نہیں فارغ کرتا ہوں۔ تم اندھلوں"

"جلد ہی کرنا۔"

"ایک منٹ میں؟ وہ بولا، تم اندھلوں میں آتا ہوں؟"

جب اسد نے دروازہ کھولا تو باہر تاروں کی روشنی میں جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ در خر تھے۔ پھر تو پر زین کسی تھی اور وہ سرخ بلکے کھڑے تھے۔ پہلی نظر میں اسد کو کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ پھر یامیں نے لالیں اٹھائی تو نیم تاریخی میں دو آدمیوں کی شکلیں نظر آئیں۔ صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا کہ ان آدمیوں نے دریا پر رکھی تھیں یا سادے لباس میں تھے، مگر ان میں سے ایک دروازے کے ایک طرف اور دوسرا دری طرف دروازے سے نگ کر کھڑے تھے، جیسے پھرے دار ہوں۔ جب اسد نے دلپیزیر پر قدم رکھا تو وہ آدمی اپنی چکر کے رہے، مگر اسد نے محسوس کیا ان دونوں میں خفیت سی حرکت ہوئی ہے، جیسے آگے بڑھنے سے پہلے بدن کو سنبھال رہے ہوں۔ اسد دلپیزیر ایک پاؤں رکھے رکارا۔ اچانک پیچے سے یا سہیں کی بے دم اواز آئی: "دروازہ بند کر لو، اسد ہی۔" ابھی الفاظ اس کے نزد میں تھے کہ دونوں نے جھپٹ کر اسد کو ہوا میں اٹھایا۔ وہ اپنے بازو اسکی کمراوی میں ڈالے، اٹھائے اٹھائے اسے ایک خچر کے پاس لے گئے۔ وہاں پر انہوں نے اسے اوپر اٹھا کر آہستہ سے خچر کی لپشت پر بٹھا دیا۔ اسد کے بدن سے مراحت خارج ہو چکی تھی۔ وہ اپنا بوجہ ان کے بازوؤں کی پاکی پوٹالے آرام سے خچر کے اوپر جا بیٹھا۔ کہنئی پر بیٹھا خچر کے بعد اس نے نیچے کر دنے کی گوشش کی، میکروں پنے جسم کر دیں اور یامیں کچھ لکھ کر زین کی مضبوطی کر جانچا اور پھر ایک جگہ پر جسم کر بیٹھ گیا۔ ایک آنی چلانگ لگا کر اس کے پیچے سوار ہوا۔ اس آدمی نے اسکی بغلوں کے بیچ سے انتہا گے بھاگ کے بھاگ سنبھال لی۔ خچر نے سر اٹھایا اور لمبے لمبے کان گول پھروں میں پھرانتے لگا۔ اسد سیدھا بیٹھا خچر کے گھومتے ہوئے کافوں کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے کان میں ایک آواز آئی: "چھوڑ دو۔" بھیجے چھوڑ دو۔

اس آواز کی یا سہیں کی آواز سے، یا کسی انسان یا حیوان کی آواز سے مشاہدہ نہ تھی، بلکہ ایک بادل کے پھٹنے کی سی آواز تھی۔ صرف اس کو عالم تھا کہ یہ آواز یا سہیں کی ہے، اور اپنے نیم خواب ذہن کے اندر وہ اس آواز کا منتظر تھا۔ مگر اس بھٹی ہرلئی گرج دار آواز کا وہ مستر قع نہ تھا۔ وہ چونکہ پڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بُری بھتی خیہیں پل پل عقب سے یا سہیں کی کمرہ میں باہمیں ڈالے پورے ندر سے اسے اندر کی طرف کھینچنے ہوئے تھی۔ یا سہیں آدمی دروازے کے اندر اور آدمی باہر، دونوں بازوں اپنے آگے ہوا میں پھیلا لئے رات کی تاریخی

ہیں اُن فراری سیاروں کو کچڑنے کی کوشش کر رہی تھی جو غائب ہوتے جا رہے تھے۔

"بچھے جانے دو" وہ گرج رہی تھی، "بچھے جانے دو" اسدی، اُس نے ایک لمبی کوک لگائی،

"اسدی بھی" —

پھر اُس کی آواز کا زور دوٹنے لگا۔ "بچھے چھوڑ کر نہ جاؤ" وہ اپر لگاتے ہوئے پھر دل کے پیچے اُس سیست ناک آواز میں پکار کر بولی، "بچھے چھوڑ کر نہ جاؤ" —

دیکھتے دیکھتے پھر تابجی میں غایب ہو گئے۔ گاریں میں اُس دلت صرف اکاڈمی کا مرد موجود تھے۔ اس شور پھر دل کے درداز سے لکھنے لگے۔ کہیں کہیں سے خود تین اور مرد اور نیچے نکل کر اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ جب یا سہیں ہار کر درداز سے کے اندر نہ میں پڑ دھیر ہو گئی تھیں بی بی نے نہ سے باز دوں میں جھر کر اٹھانے کی کوشش کی، پھر وہ بھی ہار کر اُس کے پاس بیٹھ رہی۔ یا سہیں کی شکوار پرخون کا ایک حصہ نمودار ہو کر چیلتا جا رہا تھا۔ رات آدھی نیکل چکی تھی۔

(۴)

Ah, but a man's reach should exceed his grasp or what's a heaven for.

R. Browning